۱۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء

رجسٹرڈ نمبر L. 922
فون نمبر ــــ 29

ہفتہ وار
ہماری زبان

ایڈیٹر
آل احمد سرور

فی کاپی پندرہ پیسے
قیمت سالانہ پانچ روپے
اشاعت کی تاریخیں

جلد ۳۰ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۴۷

آل احمد سرور

صادق صاحب

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مرگئے

رات ریڈیو پر غلام محمد صادق کے انتقال کی خبر سنی۔ ادھر وہ خاصے بیمار رہے۔ اگست میں بیمار پڑے۔ خون دیا گیا۔ بہترین علاج ہوا اور ٹھیک ہوگئے۔ اپنے کام میں لگ گئے۔ اکتوبر کے وسط میں انجمن کا ایک وفد ملنے گیا۔ دہلی میں ان سے ملا تھا۔ اردو گھر کے لئے ان سے امداد کی درخواست کی تھی۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ جو ہوسکا کروں گا۔ میں نے کچھ عرصے بعد یاد دہانی بھی کردی تھی۔ مگر ۴ ر نومبر کو پھر سخت بیمار پڑے اور چنڈی گڑھ کے اسپتال میں علاج کے لئے لائے گئے۔ اخباروں سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ بہتر ہو رہے ہیں۔ مگر ۱۲ ر دسمبر کو ناشتے کے بعد بے چینی محسوس ہوئی اور تھوڑی دیر میں ختم ہوگئے۔ ان کا ایک گردہ کچھ دن پہلے ہی سے کام نہیں کر رہا تھا۔ دوسرے گردے میں بھی خرابی ہوگئی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ جگر بھی متاثر ہوگیا۔ امکانی کوشش جو ہوسکتی تھی سبھی کی گئی، مگر مشیت ایزدی میں کسے دخل ہے۔

صادق کی موت نے ۱۹۳۲ء کا وہ زمانہ یاد دلادیا جب میں علی گڑھ، انگریزی میں ایم۔ اے کرنے آیا تھا۔ صادق قانون پڑھنے اسی سال یہاں پہنچے تھے اور افضل بیگ اور غلام محمد بخشی کے ساتھ ممتاز ہاؤس میں ان کا قیام تھا۔ ممتاز ہاؤس میں میرے اور میرے خالہ زاد بھائی اور دوست انفعال حسین قادری کے ایک دوست نواب زادہ علی صغیر رہتے تھے۔ یہ اب گورکھپور میں وکالت کرتے ہیں۔ میں ان سے ملنے ممتاز ہاؤس اکثر جایا کرتا تھا۔ یہیں صادق اور افضل بیگ اور غلام محمد بخشی سے ملاقات ہوئی۔ افضل بیگ میں شوخی تھی اور باتیں بھی خوب کرتے تھے۔ صادق اور غلام محمد دونوں خاموش، کم گو اور متین تھے۔ ہم لوگ اکثر ساتھ نمائش جاتے تھے، یا علی گڑھ کی سڑکوں پر ٹہلتے تھے۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتی تھیں۔ میں ۱۹۳۳ء میں کشمیر گیا تھا۔ سید محمود حسین لیکچرر شعبۂ انگریزی اور وارڈن ممتاز ہاؤس کے اہل وعیال بھی ساتھ تھے۔ افضل بیگ اور صادق نے وہاں ہم لوگوں کی بڑی خاطر کی۔ یہ لوگ اسی زمانے میں کشمیر کی عوامی تحریک میں شریک ہوگئے تھے جس نے شیخ عبداللہ کی قیادت میں ڈوگرا راج کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس زمانے میں بھی صادق اور افضل بیگ شیخ عبداللہ کے ممتاز ساتھیوں میں تھے۔ ۱۹۳۴ء میں صادق کشمیر واپس چلے گئے مگر وکالت کرنے کے بجائے مسلم کانفرنس میں تن من دھن سے کام کرنے لگے۔ شروع ہی سے ان کے خیالات بائیں بازو کی طرف مائل تھے۔ چند سال کے بعد مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس کا روپ دینے میں صادق کی کوششوں کو بہت دخل تھا۔ ۱۹۴۷ء تک صادق نے دانش وروں، قومی کارکنوں اور ترقی پسند حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کرلی تھی۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستانی حملہ آوروں نے وادی کشمیر میں دراندازی کی اور سری نگر کے ہوائی اڈے کے قریب تک پہنچ گئے تو صادق نے شیخ عبداللہ کی قیادت میں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے لئے کوشش کی اور عوام کو پاکستانی

حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے کشمیر ملیشیا بنائی۔ شیخ عبداللہ کی حکومت میں شروع میں صادق بھی وزیر تھے مگر انھیں بعد میں دستور ساز اسمبلی کا صدر اور پھر قانون ساز اسمبلی کا اسپیکر مقرر کیا گیا۔ جب ۱۹۵۲ء میں، یونیورسٹی میں توسیعی لیکچر دینے میں کشمیر گیا تو اس وقت اندازہ ہوا کہ شیخ صاحب اور صادق کے درمیان کچھ اصولی اختلافات ہوگئے تھے۔ صادق ہندوستان کے ساتھ رشتہ مضبوط کرنے، سوشلزم پر عمل کرنے اور بائیں بازو کی پارٹیوں کی حمایت حاصل کرنے کے حق میں تھے۔ شیخ صاحب کے خیالات میں کچھ تبدیلی ہوگئی تھی۔ جب اگست ۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کو گرفتار کرلیا گیا تو بخشی کی قیادت میں وزارت بنی اور صادق نائب وزیر اعظم ہوئے، صادق نے کشمیر میں تعلیم کی ترقی پر بہت زور دیا اور جابجا اسکول اور کالج کھولے۔ جب بخشی سے ان کے اختلافات بڑھے تو وہ وزارت سے علیحدہ ہوگئے اور ڈی۔ پی۔ دھر کے ساتھ انھوں نے ایک جمہوری محاذ بنایا، مگر بعد میں جواہر لال نہرو کے اصرار پر نیشنل کانفرنس میں واپس آئے۔ جواہر لال نہرو نے چونکہ شروع سے کشمیر کی بیداری اور وہاں کے عوام کی اپنے حقوق کے لئے جدوجہد میں حصّہ لیا تھا، اس لئے قدرتاً وہ جواہر لال نہرو سے خاصے قریب تھے۔ جب کامراج پلان کے تحت بخشی کو ہٹنا پڑا تو جواہر لال نہرو چاہتے تھے کہ صادق کو کشمیر کا وزیر اعظم بنایا جائے، مگر انھوں نے شمس الدین کو وزیر اعظم بنایا۔ انھیں بالآخر موئے مبارک کی چوری کا سیلاب بہالے گیا۔ غرض ۱۹۶۴ء میں صادق کشمیر کے وزیر اعظم ہوئے اور انھوں نے سات برس سے زیادہ عرصے کشمیر کو ترقی اور خوش حالی کے راستے پر چلایا۔ صادق صحیح معنی میں دانشور تھے۔ انھوں نے اپنے مخالفوں کو بھی اظہار خیال کی آزادی دی۔ وہ اپنی دیانت، ایمانداری، علمی صلاحیت اور روشن خیالی کے لئے مشہور تھے۔ انھوں نے کشمیری کے فروغ میں نمایاں حصّہ لیا اور ڈوگری کی ترقی کے لیے بھی کوشش کی۔ ان کی یہ کمزوری ضرور تھی کہ وہ زیادہ ملنے جلنے والے آدمی نہیں تھے۔ باتیں بھی کم کرتے تھے، مگر وہ ہمارے قومی لیڈروں میں اس لحاظ سے ممتاز تھے کہ عالمی میلانات، جدید علوم اور جدید افکار پر ان کی نظر گہری تھی۔ ترقی پسند افکار و خیالات سے انھیں آخر تک گہری دلچسپی رہی۔ ان کی کوشش سے کشمیر میں سیکولر اور جمہوری عناصر کو بڑی تقویت ملی اور کشمیر اور ہندوستان کا رشتہ مستحکم ہوا۔

صادق بڑے شریف اور وضع دار آدمی تھے۔ جب ملاقات ہوتی، اپنے پرانے ساتھیوں کی خیریت ضرور پوچھتے تھے۔ سیاسی اختلافات کے باوجود وہ ذاتی مراسم کا لحاظ رکھتے تھے۔ دانشوروں ادیبوں اور شاعروں کی قدر کرتے تھے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ علی گڑھ سے اور اپنی مادر درسگاہ سے ان کی دلچسپی برابر قائم رہی اور اس کی فلاح و بہبود میں وہ برابر حصّہ لیتے رہے۔ صادق کی موت سے کشمیر کا ایک عظیم رہنما، ہندوستان کا ایک ممتاز لیڈر، سیکولر اور جمہوری عناصر کا ایک ستون، ایک پاکیزہ صفت مہذب اور شریف انسان اور ایک دلنواز دوست کم ہوگیا۔ اس وقت جب ہندوستان ایک بحران سے دوچار ہے اور جنگ کشمیر کی سرحد کے اندر ہورہی ہے، صادق جیسے مستقل مزاج قومی لیڈر کی سخت ضرورت تھی مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ صادق تو ہم سے رخصت ہوگئے مگر انھوں نے جو چراغ جلایا ہے اس کی روشنی کشمیر اور ہندوستان میں باقی رہے گی اور آنے والوں کے فکر و نظر کو اجالا بخشتی رہے گی۔ امید ہے کہ ان کے جانشین ان کے راستے پر گامزن رہیں گے۔

اسد جعفری کا انتقال

جواں سال انقلابی اخبار نویس اسد جعفری ایڈیٹر "حیات" کا ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۳۰ر نومبر کی رات میں ایک بدبختانہ حادثہ کا شکار ہوگئے تھے ان کا علاج ارون اور پھر پنتھ نرسنگ ہوم میں ہوتا رہا مگر جانبر نہ ہوسکے۔ مرحوم اردو کے نوجوان لیکن آزمودہ کار اخبار نویس تھے۔ انھوں نے کئی اخباروں میں ایڈیٹری کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دئے۔ ۱۹۶۷ء میں ایڈیٹر "حیات" کی ذمہ داری سنبھالی اور آخری دم تک اس کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

• حیات

گولڈ میڈل کا عطیہ

گورکھپور:۔ صدر میر اکیڈمی جناب مقبول احمد لاری نے گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک گولڈ میڈل دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ گولڈ میڈل جو "لاری گولڈ میڈل" کے نام سے موسوم ہوگا ہر سال ایم۔اے (اردو) میں اول آنے والے طالب علم کو دیا جائے گا۔

• سید فضل امام رضوی

عبدالقوی دسنوی

مولانا ابوالکلام آزاد — فکروفن

ستمبر ۱۹۶۹ء میں لکھنؤ سے ایک کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد فکروفن" شائع ہوئی ہے جس کے سرورق پر ناشر نے اعلان کیا ہے:

"اس مقالے پر گورکھپور یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی۔"

پہلی نظر میں کتاب کی ظاہری خوبیوں کو دیکھ کر یہ امید بندھ جاتی ہے کہ شاید مولانا آزاد پر یونیورسٹی کی نگرانی میں ایک اچھا کام ہوا ہے لیکن ابتدائی اوراق کے مطالعہ سے بڑی مایوسی ہوئی اور احساس ہوا کہ اس مقالہ کی تیاری میں جس تفحص و تلاش اور محنت و ریاضت کی ضرورت تھی اس سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ بعض ایسی کتابوں اور تحریروں سے اس مقالے کی تیاری میں مدد لی گئی ہے جن کا تحقیق میں کوئی درجہ نہیں چنانچہ اسی وجہ سے مقالہ نگار کو جگہ جگہ لغزشوں کا شکار رہنا پڑا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"حالی سے مولانا کی ملاقات ۱۹۰۱ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں ہوئی ہوگی وحیدالدین سلیم نے جب مولانا کا تعارف حالی سے کرایا کہ یہ لسان الصدق کے ایڈیٹر ہیں تو انھیں بہت زیادہ تعجب ہوا۔"[1]

یہ ۱۹۰۱ء میں لسان الصدق کب شائع ہوا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو منظر عام پر آیا تھا۔[2] جناب مالک رام نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

"......اسی رسالے کی شہرت نے انھیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس ۱۹۰۴ء میں شرکت کی ترغیب دی۔ یہ اجلاس یکم اپریل سے ۳ اپریل تک لاہور میں ہوا تھا۔ اسی موقع پر مولانا آزاد کی پہلی مرتبہ مولانا حالی سے ملاقات ہوئی جو جلسے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔"[3]

علامہ شبلی سے ملاقات کے سلسلے میں تحریر ہے:

"شبلی سے ۱۹۰۴ء میں ملے بمبئی کی یہ ملاقات دونوں کے درمیان استوار رفاقت کا سنگ بنیاد بن گئی۔..."[4]

علامہ سید سلیمان ندوی اس ملاقات کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے۔ یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا۔ مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے تھے۔"[5]

جناب مالک رام بھی شبلی سے ملاقات کا زمانہ ۱۹۰۵ء ہی بتاتے ہیں:

"۱۹۰۵ء کے شروع میں مولانا شبلی بمبئی آئے۔ وہ ان ایام میں حیدرآباد میں

شورانج بہار

موجِ بہار

تیرے قربان اے نگاہِ ناز!
تو نے بخشا ہے سوزِ سینہ گداز
کوئی تیرے سوا نہیں دمساز
اے غمِ دوست تیری عمر دراز
کب سے ہوں تیرے آستانے پر
آرزومندِ سجدہ ہائے نیاز
کہہ رہا ہے یہ شمع کا جلنا
زندگی سر بسر ہے سوز و گداز
کیوں ہے مصروفِ آشیاں بندی
ہے ترا شوق دشمنِ پرواز
عشق تیری نگاہ کا افسوں
حسن میری نگاہ کا اعجاز
حسن تیرے وجود کی تشکیل
عشق میرے ضمیر کی آواز
عشق ہی سے وقار حسن کا ہے
ناز کو بھی ہے احتیاجِ نیاز
جن کو کہتے ہیں دوزخ و جنت
تیری منزل کے ہیں نشیب و فراز
اور بھی پیاس بڑھ گئی پی کر
ہائے ساقی کے لطف کے انداز
کون ہوں، کیا ہوں، کیا بتاؤں بہارؔ
میری ہستی ہے ایک پردۂ راز

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد — فکروفن ص ۴۴

[2] لسان الصدق، عبدالقوی دسنوی اردو ادب، آزاد نمبر

[3] مولانا ابوالکلام آزاد۔ تحریر دہلی جلد ۲ شمارہ ۱ ۱۹۶۸ء ص ۸۸

[4] مولانا ابوالکلام آزاد، فکروفن ص۵۲

[5] حیات شبلی ۴۴۴

ناظم سررشتہ علوم وفنون کے عہدے پر فائز تھے۔ مولانا آزاد کی ان سے تین چار برس سے خط وکتابت تھی لیکن ملاقات پہلی مرتبہ بمبئی میں ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے مقام شناس ہوگئے۔[1]"

مولانا ابوالکلام آزاد اور الندوہ کے سلسلے میں اس باب میں درج ہے:

"شبلی ہی کے اصرار پر مولانا لکھنؤ آئے اور الندوہ کی اڈیٹری قبول کرلی۔ لکھنؤ میں سات آٹھ مہینے کا یہ قیام صبح خیزی کا اچھا ذہنی اور علمی تربیت کا دور تھا۔[2]"

مولانا ابوالکلام آزاد ماہنامہ الندوہ کے کبھی (تنہا) اڈیٹر نہیں رہے البتہ چھ ماہ کے لئے سب اڈیٹر رہے علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا آزاد دہلوی الندوہ کے سب اڈیٹر رہے۔[3]"

ایک جگہ تحریر ہے:

"یہی وہ وقت تھا جب مولانا نے نیرنگ عالم نامی گلدستہ بھی جاری کیا جس کے صرف آٹھ نمبر نکل سکے۔[4]"

"یہی وہ وقت تھا" سے سنہ کا پتہ نہیں چلتا، البتہ اگلے اور پچھلے صفحات کے مطالعہ سے ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن صفحہ ۸۶ پر لکھا گیا ہے:

"انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۸۹۹ء کے آخر ہی میں کردیا تھا جبکہ شاعری کے شوق کی بنا پر ان کے ذہن میں ایک گلدستہ نکالنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ انھوں نے نیرنگ عالم کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جو صرف آٹھ مہینے تک جاری رہا اور آٹھ نمبروں کے بعد بند ہوگیا۔[1]"

مالک رام صاحب اسی گلدستہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"چنانچہ مقامی اور بیرونی شعراء سے غزلیں جمع کی گئیں۔ اس گلدستہ کا نام "نیرنگ عالم" تھا۔ یہ ہادی پریس کلکتہ میں چھپا تھا۔ یہ پرچہ ۱۸۹۹ء کے آغاز میں نکلا اور سال کے اندر ہی بند بھی ہوگیا۔[2]"

جناب عابد رضا بیدار رقمطراز ہیں:

"مولانا نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ایک گلدستہ "نیرنگ عالم" شائع کرکے کیا جس کے دو چار شماروں سے زیادہ نہ نکلے ہوں گے ۔۔۔۔ ۱۸۹۹ء - ۱۹۰۰ء کی بات ہے۔[3]"

"المصباح" کے سلسلے میں بتایا گیا ہے:

"پہلا اخبار جسے مولانا نے ایڈٹ کیا، اس کا نام "المصباح" تھا یہ ۱۹۰۰ء کے آواخر کی

رحمن جامی

لگاوٹ کی زنجیر

یہ مری زندگی
ٹھوکریں کھاکے بھی
حادثوں پہ یونہی مسکراتی رہی
کتنی گمبھیر ہے زندگی کی لگن

اور تیری اداؤں کا یہ بانکپن
جانے کیوں تجھ پہ تھا ہر گھڑی خندہ زن

لیکن اک آج کا حادثہ اور تھا
میں جو زخمی ہوا
جانے کیوں تیرے دل میں ہوئی ہے چبھن
میری پرسش کرائی گئی کس لئے
جب مرا تجھ سے کوئی تعلق نہ تھا
اب تو میں غیر ہوں
اب تو کوئی بھی ہے بے شک کسی غیر کا آسرا

لیکن اب میں یہی سوچتا ہوں
لگاوٹ کی زنجیر بھی کتنی مضبوط ہے

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد۔ تحریر جلد ۲ شمارہ ۱ ۱۹۶۸ء ص ۹۲
[2] مولانا ابوالکلام آزاد۔ ذکر وفن ۴۵
[3] حیات شبلی ص ۴۴۳۔
[4] مولانا ابوالکلام آزاد ذکر وفن ص ۷۶

[1] مولانا ابوالکلام از ذکر وفن
[2] مولانا ابوالکلام آزاد۔ تحریر جلد ۲ شمارہ ۱ ص ۸۵
[3] مولانا ابوالکلام آزاد۔ عابد رضا بیدار ص ۷۸

بات ہے جب مولانا کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی[1]"

عابد رضا بیدار کا خیال ہے:

"اس کے (نیرنگ عالم) بعد ایک اخبار "المصباح" جاری کیا۔ یہ بھی تین ماہ چل کر بند ہو گیا۔ یہ ۱۸۹۹ء-۱۹۰۰ء کی بات ہے[2]۔"

جناب مالک رام اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

"اس کے بعد انھوں نے ایک شخص محمد یحییٰ سے بات چیت کر کے ہفتہ وار المصباح جاری کیا اس کا پہلا پرچہ ان کے بقول (آزاد کی کہانی) ٹھیک عید الفطر کے دن شائع ہوا اس میں انھوں نے اداریہ عید کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ اداریہ غالباً بعض دوسرے اخباروں میں بھی نقل ہوا تھا، جیسے اخبار لاہور کا نام تو خود مولانا ہی نے لکھا ہے۔ اگرچہ انھوں نے المصباح کی اشاعت کی تاریخ اواخر سال ۱۹۰۰ء لکھی ہے۔ لیکن یہ سہو ہے اس لئے کہ رمضان کی پہلی بیشک ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۰ء کو تھی لیکن عید الفطر شنبہ کے دن ۲۲ر جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوئی تھی، اس لئے المصباح کا پہلا شمارہ بھی اسی موقع پر شائع ہوا ہو گا[3]۔"

مولانا آزاد کے مخزن میں مضامین شائع ہونے کے سلسلے میں لکھا گیا ہے:

"المصباح کے بند ہو جانے کے بعد مولانا نے کئی مضامین لکھ کر مخزن میں بھیجے جو شیخ عبد القادر کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ یہ مضامین شائع ہوئے[4]۔"

"یہ کئی مضامین" مخزن کے کن شماروں میں شائع ہوئے۔ جہاں تک مجھے علم ہے صرف دو مضمون "فن اخبار نویسی" (مخزن مئی ۱۹۰۲ء) اور حکیم خاقانی شروانی (مخزن اگست ۱۹۰۲ء) شائع ہوئے۔ یہ دونوں مضامین میں نے اردو ادب کے آزاد نمبر کے لئے بھیجے تھے جو اس میں شائع ہو گئے تھے۔ مصنف نے اپنی کتاب میں انھیں دونوں مضامین کی نشاندہی کی ہے۔

احسن الاخبار اور مولانا آزاد کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"۱۹۰۱ء میں مولانا کا تعلق احسن الاخبار سے ہو گیا جو بعد کی صحافتی زندگی میں مولانا کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ یہ اخبار مولوی احمد حسین اور عبد الغفار کے اشتراک سے نکلا[1]۔"

مولانا آزاد کا تعلق احسن الاخبار سے کس قسم کا تھا مصنف نے اس سلسلے میں آزاد کی کہانی کی مدد سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے:

"احسن الاخبار میں مولانا نے ہر طرح کے مضامین لکھے، کچھ مضامین کی وجہ سے بحث و مباحثہ کا ہنگامہ بھی چھڑا جس میں اشہری مرحوم اور بعض اور کہنہ مشق مضمون نگار حضرات نے حصہ لیا لیکن مولانا نے متعدد مضامین شعرائے ایران کے حالات اور ان کے کلام پر ریویو کے طور پر لکھے تھے۔ ۔ ۔ ۔[1]"

مولانا آزاد نے مولوی احمد حسن کے انتقال پر "سید احمد حسن اب کہاں ہیں؟" کے عنوان سے ایک مضمون لسان الصدق ۲۰ر دسمبر ۱۹۰۳ء کو شائع کیا تھا جس میں انھوں نے اپنے اور احسن الاخبار کے تعلق کے بارے میں کچھ بھی تحریر نہیں کیا ہے۔ مصنف ابو الکلام آزاد۔ فکر و فن کو چاہئے تھا کہ اس سلسلے میں دوسرے حوالوں کی مدد سے بھی حقائق کی تلاش کرتے۔

"خدنگ نظر" سے تعلق کے بارے میں درج ہے:

"۱۹۰۳ء میں مولانا کو "خدنگ نظر" لکھنؤ کے حصہ نثر کی ایڈیٹری ملی یہ گلدستہ منشی نوبت رائے نظر لکھنؤ سے نکالتے تھے۔ اس میں نثر کا حصہ بھی شامل کیا گیا[2]۔"

مندرجہ بالا تحریر سے محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں مولانا آزاد "خدنگ نظر" کے حصہ نثر کے ایڈیٹر ہوئے اور اس کے بعد ہی سے اس ماہنامہ میں نثر کے حصے کا اضافہ ہوا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔

"چنانچہ اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد مارچ ۱۹۰۳ء کے بعد سے خدنگ نظر کے اسسٹنٹ اڈیٹر ہوئے اور ان کے مضامین مارچ ۱۹۰۳ء سے پہلے بھی اس پرچہ میں شائع ہوتے رہے ہیں[3]۔"

---

[1] مولانا ابو الکلام آزاد۔ فکر و فن۔ ص ۸۷

[2] مولانا ابو الکلام آزاد۔ ص ۸۸

[3] مولانا ابو الکلام آزاد، تحریر جلد ۳ شمارہ ۱۵، ص ۸۶

[4] مولانا ابو الکلام آزاد، فکر و فن ص ۸۸

---

[1] مولانا ابو الکلام۔ فکر و فن ص ۸۸

[2] مولانا ابو الکلام آزاد، فکر و فن ص ۹۰

[3] ایضاً ص ۹۲

[4] مولانا ابو الکلام آزاد اور خدنگ نظر۔ عبد القوی دسنوی یکم رنومبر ۱۹۶۶ء

لسان الصدق کے سلسلے میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے ؛

"احسن الاخبار" کے بند ہو جانے پر مولوی محمد یوسف جعفری کے مشورہ سے مولانا نے "لسان الصدق" کا اجرا کیا، ملیح آبادی کی روایت کے مطابق اس اخبار کے نکالنے میں جو جذبہ ہنگامی اور وقتی طور پر کارفرما تھا وہ محض یہ تھا کہ مبادلے میں اخبارات حاصل کئے جائیں ———

۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء کو اس کا پہلا شمارہ مولانا نے شائع کیا، شروع میں ارادہ یہ تھا کہ یہ رسالہ مہینے میں دو مرتبہ فلس کیپ تقطیع پر ایک جزو کا نکالا جائے گا، مگر چھ ماہ بعد اس کی مقبولیت دیکھ کر اس ضخامت میں اضافہ کر دیا گیا۔[1]"

مندرجہ بالا عبارت سے یہ باتیں معلوم ہوئیں

(۱) اس پرچہ کے نکالنے میں جو جذبہ ہنگامی اور وقتی طور پر کارفرما تھا وہ محض یہ تھا کہ مبادلے میں اخبارات حاصل کئے جائیں۔

(۲) چھ ماہ بعد اس کی مقبولیت دیکھ کر اس کی ضخامت میں اضافہ کر دیا گیا۔

(۳) اور اسے ماہوار کر دیا گیا۔

(۱) پرچہ کے نکالنے کے سلسلہ میں جس جذبہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی صداقت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے البتہ اس کے یہ چار مقاصد ضرور تھے۔

(۱) سوشل رفارم

(۲) ترقی اردو

(۳) علمی مذاق

(۴) تنقید۔

(۲) چھ ماہ بعد نہیں بلکہ تین ماہ بعد یعنی فروری ۱۹۰۴ء سے اس کی ضخامت ۱۶ صفحہ کے بجائے ۲۴ صفحات ہو گئی پھر مئی ۱۹۰۴ء میں اس کی ضخامت ۳۲ صفحات ہو گئی، جون و جولائی کے شمارے ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں اور اس کی ضخامت ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ چند باتیں سرسری مطالعہ کے بعد اس کتاب میں نظر آئیں۔ اسی طرح کی باتیں اکثر و بیشتر ان تحریروں میں نظر آتی ہیں جو مولانا آزاد سے متعلق شائع ہوتی رہی ہیں۔ مندرجہ بالا باتوں کی طرف اشارہ کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جن کی شخصیت اردو اور ہندوستان دونوں کے لئے بہت اہم ہے ان کے انتقال کو بارہ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں لیکن ان کی زندگی سے متعلق کوئی اچھی کتاب اب تک سامنے نہیں آئی ہے۔

ضرورت ہے کہ حکومت یا کوئی ادارہ (انجمن ترقی اردو ہند بھی غور کرے) مولانا سے متعلق ایسی معیاری کتابیں شائع کرے جو ان کی حیات، ان کے ادبی کارنامے، ان کے سیاسی شعور اور قومی خدمات سے متعلق بھرپور ہوں اور جو نہ صرف واقعات یا اقتباسات کا پلندہ ہوں بلکہ تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر پیش کی گئی ہوں۔

▲

(صفحہ ۸ سے آگے)

جس میں مسرز عبدالجبار (صدر) عبدالعزیز (نائب صدر) جلیل احمد (معتمد) محمد عبدالستار احمد (شریک معتمد) اور لی کنتیا (خازن) منتخب ہوئے۔ جناب گنگادھر ریڈی ایڈوکیٹ مشیر قانونی چنے گئے پھر جناب گنگادھر ریڈی کی صدارت میں ایک اور جلسہ ہوا جناب جلیل احمد معتمد نے اردو تعلیم سے متعلق رپورٹ پیش کی۔ جناب نرسمہا راؤ جوشی نے کہا کہ آندھرا پردیش کے سابق چیف منسٹر بل نے اردو کے تعلق سے جو تیقنات دئے ہیں اس پر حالیہ چیف منسٹر کو خصوصی توجہ کرنی چاہئے۔ جناب گنگادھر ریڈی نے کہا کہ اگر اردو کو دوسری علاقائی زبان کا مرتبہ دیا جائے تو اس سے قومی یکجہتی پروان چڑھے گی۔ جناب لاہوٹی نے اردو والوں کو احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ خیال غلط ہے کہ اردو پڑھنے سے ملازمت نہیں ملے گی۔

• سیاست حیدرآباد

[1] مولانا ابوالکلام۔ فکر و فن۔ ص ۹۳

مراسلات

اردو کو فرقہ وارانہ رنگ میں پیش کرنا

نقصان دہ

۱۵ر نومبر ۱۹۷۱ء کے شمارے میں جناب محمد یونس سلیم کا ایک بیان "سالار بنگلور" کے حوالے سے "اردو مسلمانوں کی زندگی اور موت کا سوال ہے" کے زیر عنوان شائع کیا گیا ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

سلیم صاحب تو ایک طرف قوم پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں تو دوسری طرف تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

کیا اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے؟ کیا اردو زبان کے ختم ہونے سے واقعی مسلمان مر جائیں گے! اس کے بنانے سنوارنے میں کیا ہندوؤں کا ہاتھ نہیں ہے؟ کچھ لوگ تعصب اور تنگ نظری کی عینک لگا کر تاریخ اور صداقت سے نہ صرف چشم پوشی کرتے ہیں بلکہ اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو زبان کے کتنے بڑے بڑے ہندو شاعر اور ادیب گزرے ہیں جو محسن اردو ہی نہیں بانیان اردو میں سے تھے۔ اردو زبان کا پہلا شاعر پنڈت چندر بھان برہمن ہے جس نے زلف اردو کو ایسا سنوارا اور سجایا جس کی خوشبو سے آج بھی گلشن اردو تر و تازہ و معطر ہے جس کی اردو نوازی کا آج بھی ملک کے بڑے بڑے شاعر (بلا لحاظ مذہب و ملت) اعتراف کرتے ہیں۔ چند ایسی ہی مشہور شخصیتیں جن میں منشی نوبت رائے نظر، جگت موہن لال رواں، علامہ دتاتریہ موہن کیفی، پنڈت لبھو رام جوش (مشہور نعت گو شاعر)، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، شام موہن لال جگر بریلوی، منشی پریم چند، منشی تیرتھ رام فیروز پوری، رام بابو سکسینہ، تلوک چند محروم، علامہ جوش ملسیانی، گوپی ناتھ امن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، علامہ بشیشور پرشاد منور لکھنوی، ہری چند اختر، حضرت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عرش ملسیانی، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، نریش کمار شاد اور ان کے علاوہ کئی مشہور و ممتاز ادبا و شعرا (بخوف طوالت میں نے چند ہی ناموں کا تذکرہ کیا ہے) گزرے ہیں اور موجود ہیں، کیا ان حضرات نے اپنا خون جگر صرف کر کے اردو کو پروان نہیں چڑھایا؟ کیا اس کے پھولنے پھلنے میں انھوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کا ساتھ نہیں دیا؟ کیا ان کی مادری زبان اردو نہیں تھی؟ اور تحریک اردو کے نام پر انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا؟۔

ایسے پر آشوب دور میں جبکہ ملک کو قومی یکجہتی کی ضرورت ہے ایسے مسموم بیانات دے کر سلیم صاحب اردو زبان کی کچھ اچھی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ اگر یہی سلسلہ اور رویہ آئندہ بھی برقرار رہا تو اردو زبان کے شیدائی ہندو بھائیوں میں اردو کے تعلق سے مایوسی، بدظنی اور منافرت کا جذبہ یقیناً پیدا ہوگا اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اردو ہم سب ہندوستانیوں کی ہے اور اردو کی موت قومی یکجہتی کی موت ہے۔

• راجہ تعلق راجہ صدر اردو سبھا

خط کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مقبولیت

(مندرجہ ذیل خط ناظم خط کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام موصول ہوا ہے۔ اس کورس کی مقبولیت کے پیش نظر اس خط کی نقل یہاں پیش کی جاتی ہے۔ ادارہ)

"ہماری زبان" میں اردو خط و کتابت کورس کی سہ ماہی رپورٹ نظر سے گزری۔ اردو زبان و ادب کی بقا و تحفظ کے لئے آپ کا یہ اقدام قابل تحسین ہے۔ انشاءاللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ اردو کی مقبولیت کے لئے اہل اردو کا فرض ہے کہ ہر طرح آپ کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ میں ذاتی طور پر سنبلپور میں بھی غیر اردو داں دوستوں کو اس کورس کی مدد سے اردو سیکھنے کی ترغیب دوں گا۔ آپ کی رپورٹ میں ریاست اڑیسہ کا نام نہ پا کر مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔ براہ کرم اپنے ادارے کے اصول و ضوابط، داخلہ فارم اور نصاب کی کتابیں بطور نمونہ ارسال فرمائیں۔ تاکہ اپنے احباب کی توجہ اس کی جانب مبذول کرا سکوں۔ اگر اڑیہ کی مدد سے اردو سکھانے کی کوشش کی جائے تو اڑیسہ میں بھی اس کورس کو کافی مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کوئی کام آسکتا ہے تو تحریر فرمائیں۔ یہاں ہم نے اڑیہ میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ گذشتہ سات سال سے اردو میڈیم اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔ ممکن ہے اردو کی خدمت میں آپ کا ہاتھ بٹا سکوں۔ اس کے علاوہ میری رائے ہے کہ اڑیہ اخباروں اور رسالوں میں اردو خط و کتابت کورس کے اشتہارات شائع کئے جائیں، نیز تعلیمی اداروں کے سربراہوں کے پاس اشتہاری لٹریچر روانہ کئے جائیں۔ سنبلپور کے چند تعلیمی اداروں کے نام اور پتے ارسال کر رہا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں انھیں اپنے کورس کے مقاصد اور نصب العین سے آگاہ فرمائیں۔ قوی امکان ہے کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی میں یہ طریقۂ کار بھی سودمند ثابت ہو۔ مزید برآں انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخوں کو مرکز سے ہدایت جاری کرائی جائیں تاکہ خط و کتابت کورس کو مقبول بنانے اور داخلے کے امیدواروں کی درخواست فراہم کرنے کی کوشش کی جائے۔

سنبلپور۔ عبدالمجید فیضی

انجمن کی خبریں

اردو کے تحفظ و ترقی کے لئے ریاستی

چیف منسٹروں کے اعلانات

حیدرآباد :- ریاستی حکومت نے یونیورسٹی کی سطح پر تلگو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا جو حالیہ فیصلہ کیا ہے۔ اس کے تعلق سے جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے ریاست کے سابق چیف منسٹروں کے تاثرات اور بیانات کو پیش کیا ہے جو انھوں نے اردو کے بارے میں دئے تھے۔

شری سنجیوا ریڈی

(۱) ریاستی حکومت نے اردو کی موجودہ اہمیت کو باقی و برقرار رکھنے اور اسے تلگو کے مساوی مرتبہ دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

(ب) دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے دوش بدوش پروان چڑھنا چاہیے۔

(ج) اردو ریاست کی ایک زبان کی حیثیت سے باقی و برقرار رہے گی۔

شری ڈی سنجیویا

I اردو کو حسب ذیل امور کی حد تک ساری ریاست آندھرا پردیش میں علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔

(ا) اردو داں افراد کے کسی بھی سرکاری جائیداد پر تقرر میں کوئی امر مانع نہ ہوگا۔

(ب) ریاستی اور سب آرڈی نیٹ سرویسوں میں جہاں ثانوی زبان میں ٹسٹ کی شرط رکھی گئی ہے یہ امتحان اردو میں لیا جائے گا اردو داں عوام کی تعداد کا لحاظ کئے بغیر اس طریقہ پر عمل ہوتا رہے گا۔

(ج) اضلاع تلنگانہ، گنٹور، کرنول اور کڑپہ میں جہاں منسٹریل اور جوڈیشیل منسٹریل سرویسوں میں تقرر کے لئے علاقائی زبان سے واقفیت لازمی گردانی گئی ہے۔ اردو کو بھی علاقائی زبان سمجھا جائے گا۔

(د) اگر کسی جائیداد پر ترقی کے لئے تلگو ٹسٹ میں کامیابی زائد قابلیت متصور کی جاتی ہو تو اردو داں ملازم کو جس نے تلگو ٹسٹ کامیاب نہیں کیا ہے صرف اسی اساس پر کسی ایسے دوسرے امیدوار کے مقابلہ میں ناقابل ترجیح نہیں سمجھا جائے گا جو مقررہ زائد قابلیت کا حامل ہو۔ اردو داں امیدوار کو بشرط استحقاق اعلیٰ تر جائیداد پر ترقی دی جائے گی۔ اور اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ایک مقررہ مدت میں تلگو ٹسٹ کا امتحان کامیاب کرے۔

(ہ) اگر کوئی شخص ہندی یا اردو سے ناواقف ہو تو اسے سرکاری ملازمت سے وابستہ ہونے کے لئے ہندی یا اردو ٹسٹ میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔

II تمام اہم اعلامیے اردو میں بھی شائع کئے جائیں گے۔

III (ا) تمام اضلاع تلنگانہ کے علاوہ آندھرا کے تین اضلاع گنٹور، کرنول اور کڑپہ میں بھی ضلع پریشدوں کے تمام اجلاسوں کی روئداد اردو میں بھی مرتب کی جائے گی۔ ایسی پنچایت سمیتیوں میں جن کی کم از کم دس فیصد آبادی اردو داں ہو، اس طریقہ پر عمل کیا جائے گا۔

(ب) ایسی مجالس بلدیہ کے لئے بھی جن کی آبادی کا دس فیصد اردو داں افراد پر مشتمل ہو اس طریقہ پر عمل ہوگا۔

IV جو درخواستیں اردو میں وصول ہوں ان کا جواب بھی اردو ہی میں دیا جائے گا لیکن مستند متن، انگریزی اور تلگو ہی سمجھا جائے گا۔

V سکریٹریٹ سرویس کی حد تک اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔

VI ایسی تمام گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ سرویسوں کے لئے جہاں ثانوی زبان کا ٹسٹ ضروری ہے اردو کو دوسری زبان کی حیثیت دی جا چکی ہے۔

(۳) شری کے۔ برہمانند ریڈی۔

انھوں نے اردو داں عوام کو یقین دلایا کہ سرکاری زبان بل پر غور و خوض کے دوران اردو کی علاقائی اہمیت کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آندھرا پردیش کی تشکیل کے وقت جناب سنجیوا ریڈی نے اردو کے تعلق سے جو پالیسی وضع کی تھی وہ ہم سبھوں کے لئے اطمینان بخش ہے۔

(۴) شری پی وی نرسمہا راؤ۔

(ا) عوام کو ریاستی حکومت کی لسانی پالیسی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ ... ذریعہ تعلیم صرف تلگو اور تلگو ہی ہو سکتا ہے۔

(ب) صرف ایسے لوگوں کا جو تلگو زبان پر عبور رکھتے ہوں ضلع کی سطح کی جائیدادوں پر تقرر کیا جائے گا۔ ہم نے انگریزی اور اردو اسی لئے رکھی کہ وہ سرکاری زبانیں تھیں۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ہمیں تلگو کو صحیح معنوں میں سرکاری زبان بنانا ہوگا۔

• سیاست حیدرآباد

اردو کو جائز مقام دینے سے قومی یکجہتی پروان چڑھے گی

خانہ پور :- جناب سرینواس لاہوٹی آرگنائزنگ سکریٹری انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے خانہ پور کا تنظیمی دورہ کیا۔ ان کی زیر نگرانی انجمن ترقی اردو شاخ خانہ پور کا ایک انتخابی جلسہ ہوا

(باقی صفحہ ... پر)

اخبار و اذکار

اردو کی ترقی کے لئے مراد آباد کو رقم دینے کا مطالبہ

ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر جناب ولی احمد خاں صاحب نے ایک صحافتی بیان میں کہا ہے کہ "اتر پردیش سرکار نے ریاست میں اردو کی ترقی کے لئے "اردو اکاڈمی" کی تشکیل کر کے ایک قابل قدر کام کیا ہے۔

اگرچہ اردو اکاڈمی کے اغراض و مقاصد ابھی منظر عام پر نہیں آئے ہیں لیکن توقع ہے کہ اردو اکاڈمی کے ذریعہ اسکولوں، کالجوں، لائبریریوں اور دیگر اداروں کو مالی امداد دی جائے گی۔ نیز یہ تجویز بھی زیر غور ہے کہ ان نو اضلاع میں جہاں پندرہ فیصدی سے زیادہ اردو داں ہیں، ڈگری درجات کی سطح پر اردو کی تعلیم کے لئے ایک ایک ڈگری کالج کو گرانٹ دی جائے گی۔ اردو اکاڈمی کی یہ تجویز لائق تحسین ہے اور اس پر عمل درآمد ہونا نہایت ضروری ہے۔

ضلع مراد آباد ان اضلاع میں سے ہے جہاں اردو داں کی تعداد پچاس فیصدی سے زیادہ ہے لیکن یہاں اردو کی تعلیم کا انتظام اطمینان بخش نہیں ہے۔ ڈگری درجات کی سطح پر تو صرف ایک ڈگری کالج، یعنی حیاتما گاندھی میموریل ڈگری کالج، سنبھل میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے لیکن یہ کالج نوساختہ ہے اور اس کی اقتصادی پوزیشن زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ مذکورہ کالج میں اردو کی بہتر تعلیم، لائبریری کے لئے اچھی کتابوں کی خریداری کے لئے حیاتما گاندھی میموریل ڈگری کالج کو سالانہ گرانٹ دی جائے۔ اس کے علاوہ انٹر، ثانوی اور پرائمری درجات کی سطح پر بھی اردو کی تعلیم کا بہتر بندوبست کیا جائے۔ تبھی حکومت کی پالیسی کامیاب ہو سکتی ہے اور اردو کو اس کا جائز حق مل سکتا ہے۔"

• ولی احمد خاں صدر ضلع کانگریس کمیٹی

گورکھپور میں یوم اصغر گونڈوی

"حلقہ ناقدین" گورکھپور کی جانب سے محمد فرید خاں ایڈووکیٹ نائب صدر "حلقہ ناقدین" کی قیام گاہ پر یوم اصغر گونڈوی زیر صدارت صدر ادارہ ڈاکٹر سلام سندیلوی منایا گیا۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اصغر گونڈوی کا انتقال ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو ہوا تھا۔ اس لحاظ سے ہم گورکھپور میں ۳۵ سال کے بعد یوم اصغر منا رہے ہیں۔ پھر انھوں نے اصغر گونڈوی کے تصوف پر روشنی ڈالی اور ان کی شاعرانہ خصوصیت کو واضح کیا۔ اس کے بعد مقبول حسین نے اصغر گونڈوی کی شاعری پر ایک مضمون پڑھا۔ موسیٰ مجروح نے اصغر کی ایک غزل ترنم سے سنائی۔ ایم کوشیادی راہی نے یہ تجویز پیش کی کہ گورکھپور میں "اصغر اکیڈمی" قائم کی جائے جو متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ آخر میں ایک شعری نشست ہوئی۔

• مقبول حسین سکریٹری حلقہ ناقدین گورکھپور

کشمیر یونیورسٹی میں تدریس غزل پر مذاکرہ

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے یہاں تدریس غزل پر ایک مذاکرہ زیر صدارت پروفیسر شمس الدین صدر شعبۂ فارسی کشمیر یونیورسٹی منعقد ہوا۔ پروفیسر محمد حسن صدر شعبۂ اردو نے اپنی افتتاحی تقریر میں چار اہم مسائل کی طرف توجہ دلائی۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے غزل کی تعلیم کس حد تک مناسب ہے دوسرے یہ کہ غزل کے متضاد مضامین کے پیش نظر مرکزی خیال سے تاثر کس طرح پیدا کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ غزل میں پروفیسر اختر انصاری کے نظریہ کے مطابق موڈ کی ہم آہنگی یا وحدت ہوتی ہے یا نہیں۔ چوتھے یہ کہ غزل کی تدریس کے وقت مدرس کو کون سے بنیادی تعلیمی مقاصد سامنے رکھنے چاہئیں۔

ڈاکٹر اسد اللہ کامل استاد شعبۂ اردو نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ان میں ایک اور اہم مسئلہ کا اضافہ ضروری ہے کہ اردو غزل ایسے طلبہ کو کس طرح پڑھانی چاہیے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ ڈاکٹر رحمان راہی استاد شعبۂ فارسی نے کہا کہ پہلا سوال زبان پڑھانے کا ہے اور ہم خواہ شاعری میں صوت اور آہنگ پر کتنا ہی زور کیوں نہ دیتے ہوں بغیر زبان سکھائے شاعری نہیں پڑھائی جا سکتی پھر غزل (اور نظم) کی قرأت سکھانے کا مسئلہ ہے اچھی طرح پڑھنے سے ابلاغ اور ترسیل کے بہت سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں شعر محض مفہوم نہیں ہے مفہوم کے علاوہ بھی اس میں بہت کچھ ہے وہ الفاظ کا جادو ہے

جو جگایا جاتا ہے اس لئے ہر شعر کے کئی مفاہیم ہو سکتے ہیں استاد کو شاعری پڑھاتے وقت دراصل شعر کو ایک تجربہ سمجھنا چاہئے خود اس تجربے سے گزرنا چاہئے اور اپنے طلبہ کو اس تجربے سے گزارنا چاہئے۔

ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی استاد شعبۂ اردو نے کہا کہ غزل کی تفہیم کی مختلف جہتیں ہوتی ہیں اور ان جہتوں کے تعین میں ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ طالب علم کی قوت متخیلہ بیدار ہو کر ان مختلف جہات کا احاطہ کرے۔

قاضی غلام محمد استاد شعبۂ ریاضیات نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ غزل کی تفہیم کے لئے شاعر کا تہذیبی اور فکری پس منظر بتانا ہوگا

پروفیسر شمس الدین احمد صدر شعبۂ فارسی نے آخر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غزل کی تدریس سے قبل کلاس میں مناسب فضا پیدا کرنا خاصہ مشکل کام ہے۔ ایک وقت میں صرف ایک ہی غزل گو شاعر کی غزلیں پڑھائی جائیں تو اس ذہنی فضا کے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

آخر میں پروفیسر محمد حسن صدر شعبۂ اردو نے جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور بحث کے اہم نکات کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ تدریس کے لئے غزلوں کا انتخاب کرتے وقت بعض امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے مسلسل یا معنوی یا فضائی وحدت رکھنے والی غزلوں کو ترجیح دینی چاہئے اور ایسی غزلوں کو منتخب کرنا چاہئے جو فکر، جذبے اور بصیرت کے اعتبار سے اہم ہوں اور طلبہ کے لئے معنویت رکھتی ہوں۔

• سکریٹری شعبۂ اردو سرینگر

اسباب بغاوت ہند کے دوسرے ایڈیشن کی رسم اجراء

فیکلٹی آف آرٹس میں مفکر قوم سرسید علیہ الرحمہ کی تاریخی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کے دوسرے ایڈیشن کے رسم اجراء کی تقریب جناب وائس چانسلر پروفیسر عبدالعلیم کی صدارت میں منائی گئی۔ رسم اجراء الحاج حافظ احمد سعید خاں صاحب چانسلر مسلم یونیورسٹی نے ادا کی۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کے پروپرائٹر جناب مولانا نیاز الدین احمد نے نواب صاحب کو کتاب کا ایک نسخہ جناب فوق کریمی صاحب کے لئے جنھوں نے اس کتاب کو اپنے طویل اور تاریخی مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا پیش کیا۔ اور نواب صاحب نے اپنے دستخطوں سے یہ نسخہ فوق کریمی صاحب کو دیا۔

جناب صدر نے اپنی مختصر سی تقریر میں فرمایا کہ اس کتاب کا مقدمہ فوق کریمی صاحب نے اپنے نظریات کے مطابق لکھا ہے اور مجھے امید ہے کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

آپ کے بعد مہمان خصوصی جناب نواب صاحب چھتاری نے اپنی تقریر میں کہا کہ مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب سرسید کے کام کو کوئی روشن کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم کو دیکھنا یہ چاہئے کہ کس نے کس دور میں کیا کام پیش کیا سرسید نے یہ کتاب حقیقت میں ایسے وقت میں لکھی کہ جب کسی کو حق گوئی کی جرأت نہ تھی۔ سرسید نے یہ کتاب لکھ کر بڑی فراست اور دور اندیشی کا ثبوت دیا یہ ان کا ایک کارنامہ ہے جو تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

آخر میں جناب پروفیسر آل سرور صدر شعبۂ اردو نے اپنی اختتامی تقریر میں اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سرسید کو صحیح معنی میں لوگ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ان کے کام کو سمجھ کر زیادہ سے زیادہ منظر عام پر لایا جائے۔

• ترجمان علی گڑھ

حرف معتبر کی رسم اجراء

اردو کے منفرد اور ممتاز شاعر بانی کے مجموعہ کلام "حرف معتبر" کی رسم اجراء زیر صدارت جناب مالک رام صاحب، غالب اکاڈمی نئی دہلی میں منائی گئی۔

مرکزی حکومت کے وزیر اندر کمار گجرال نے رسم افتتاح ادا کی۔ محمود ہاشمی، بلراج کومل، علی جواد زیدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور عابد عالمی نے مضامین پڑھے اور تقریریں کی۔ اور حرف معتبر کی اشاعت پر بانی کو مبارکباد پیش کی۔

آخر میں جناب اندر کمار گجرال نے ایسے خوبصورت مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اردو زبان میں زیادہ سے زیادہ شعری و نثری کتابیں چھپنی چاہئیں۔ اس سے اردو کو اور قوت ملے گی۔

• نامہ نگار

اردو کے سلسلے میں حکومت کے رویہ میں تبدیلی کا مطالبہ

حیدرآباد۔ اسپیکر اسمبلی جناب کے وی ویاریڈی سے اسمبلی میں ان کے چیمبر میں ملاقات کرکے علاقائی جمعیت علماء کے ایک وفد نے انھیں یادداشت پیش کی جس میں اردو کو جائز مقام دینے اور حکومت کے موجودہ رویہ کو بدلنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

• سیاست حیدرآباد

(باقی صفحہ ۱۲ سے آگے)

سابق رجسٹرار مسٹر فخرالدین تھے جن کی حمایت میں سر راس مسعود کو وائس چانسلری سے استعفا دینا پڑا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں "علی گڑھ اسٹیمپ" کا مسلسل ذکر کرتے تھے۔ چوں کہ صاحب قسم کے آدمی تھے اور اردو بھی انگریزی لہجہ میں بولتے تھے، اس لئے میں اکثر سوچا کرتا کہ یا الٰہی! علی گڑھ اسٹیمپ کا یہ خود تو نمونہ نہیں! کالج کے اساتذہ میں سے اکثر کے نام بھول چکا ہوں لیکن بعض کی شخصیتیں ذہن کے آئینہ میں تاحال موجود ہیں، انگریزی کے ایک استاد کا تدریس سے شغف اب تک یاد ہے۔ کلاس انھیں شیکسپیئر کے کرداری نام PROSPERO سے یاد کرتی تھی۔ ان کی چنگیزی داڑھی، اس پر تدریسی وجد کا عالم، شیکسپیئر کا ڈرامہ TEMPEST پڑھاتے وقت PROSPERO کے کردار میں ڈھل جاتے تھے۔ کالج کے ساتھیوں میں ایک مرعوب کن شخصیت کے۔ ایم۔ قیصر کی تھی؛ بہترین طالب علم اور بہترین کھلاڑی اردو بولنے والے بنگالی تھے۔ آج کل چین میں پاکستان کے سفیر ہیں۔ انھیں کے ہم جماعت شرمائے لجائے بچہ صورت ملک تھے جو کچھ عرصہ قبل تک چٹا گانگ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور اب بنگلہ دیش کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔

ڈھاکہ یونی ورسٹی تک میں نہ پہونچ سکا اس لئے کہ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد دلی چلا آیا، لیکن اپنے چچا ڈاکٹر محمود حسین (جو اس وقت شعبۂ تاریخ میں ریڈر تھے) کی وجہ سے یونیورسٹی کے بعض اساتذہ، تاریخ کے آر۔ سی۔ مجمدار، قانون کو انگریزی کے ڈاکٹر محمود حسن اور سنسکرت کے ڈاکٹر شہید اللہ وغیرہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان میں سرفہرست نام عندلیب شادانی مرحوم کا ہے، جنھوں نے ڈھاکے کے اجنبی ماحول میں بھی اپنی یو۔پی کی "نستعلیقیت" کو برقرار رکھا۔ ان سے مل کر دلی و لکھنؤ سے ملاقات ہوجاتی تھی، کیا عبارت، کیا اشارت، کیا کلام اور کیا طعام، ان کی ہر چیز سے ایک مخصوص کلچر کا پتہ چلتا تھا۔ اردو فارسی کے استاد تھے، ادیب، شاعر اور بذلہ سنج، اپنے بنگالی ساتھیوں کا فقرہ بازی سے ناک میں دم رکھتے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے بھئی کل سے میں بھی فارسی اشعار کے معنی اس طرح سے بتاؤں گا کہ:

خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

"اے (حافظ) خاموش مت رہ کہ تیری کار نالہ پر سے گذر رہی ہے"۔

یہ دراصل ادبی طنز تھا ایک صاحب کی فارسی سخن فہمی پر۔ ڈھاکے کے چار سال کے دوران قیام میں، اپنے سواد اعظم سے دور رہ کر میں نے بہت کچھ کھویا اور پایا بھی۔ اردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کو پڑھنے کا چسکہ مجھے یہیں پڑا۔ ہندوستان کی تمدنی بوقلمونی اور تاریخ کی گہرائی کا احساس مجھے بنگال ہی کی نغمہ پرور فضاؤں میں ہوا۔ پہلے پہل ٹیگور کے نغموں کے صوتی آہنگ سے قرار ہوا، جب معنی کے دریچے کھلنے لگے تو شعر کہنے کی ہوک سب سے پہلے یہیں اٹھی۔ بنگالی سرشت کی نرمی اور گرمی کا قریب سے تجربہ یہیں ہوا۔ بنگالی شخصیت کو بیک وقت شیر و شکر اور بنگالی مسلمان کو شدید مسلمان اور خالص بنگالی پایا۔

اس نے پہلے پاکستان میں مل کر اپنے شدید مسلمان ہونے کا ثبوت دیا اب بنگلہ دیش بنا کر وہ اپنے خالص بنگالی ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں

میرا شہر
ڈھاکہ
(یادوں کی غلام گردش میں)

زیرِ تحریر ہندوستانی افواج چاروں سمتوں سے ڈھاکے پر یلغار کر رہی ہیں۔ وقت کے دھندلکوں سے یادوں کے مینار ابھر رہے ہیں اور میں خود کو اڑتالیس سال قبل کے ڈھاکے میں کھڑا پاتا ہوں۔ ۱۹۲۳ تا ۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا جب میں اپنے چھوٹے چچا ڈاکٹر محمود حسین کے ساتھ ڈھاکہ یونی ورسٹی کیمپس میں (جو رمنہ کہلاتا تھا) نیل کھیت روڈ پر مقیم تھا۔ رمنہ کا علاقہ، جو سابق مشرقی بنگال کے دارالسلطنت کے طور پر وضع کیا گیا تھا، تقسیمِ بنگال منسوخ کئے جانے پر جوں کا توں ڈھاکہ یونی ورسٹی کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ سکریٹریٹ کی عمارت میں یونی ورسٹی تھی۔ گورنر کے محلس میں ہمارا گورنمنٹ انٹر کالج اور دیگر سرکاری مکانات میں طلبہ کے ہاسٹل اور اساتذہ کی رہائش گاہیں۔ سارا علاقہ ایک ہرا بھرا میدان (رمنہ) تھا جس میں تارکول کی چکدار، سیاہ اور بلدار سڑکیں جا بجا پڑی اینڈتی تھیں۔ کثرتِ سبزہ سے ساری فضا سبز فام تھی۔ جگہ جگہ نیلگوں آسمان کا عکس سینے میں لئے گم صم نیلے نیلے "تالاب"، تالابوں کے اردگرد ستھرے ستھرے چہرے، ہر چہرہ میں دو گہری جھیلیں! تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ناریلوں سے بھرے آموں کے کنج، بانسوں کے جنگل، سارا دیس ایک پراسرار رنگ میں!!

میرا داخلہ آرمنی ٹولہ گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں جماعت میں ہوگیا۔ اس کا شمار ڈھاکے کے اچھے اسکولوں میں ہوتا تھا اس لئے کہ یہ ایک ٹیچرز ٹریننگ کالج کے لئے تجربہ گاہ کا کام دیتا تھا۔ ساتھی طالب علموں میں مسلمان کم اور ہندو زیادہ تھے۔ بنگالی مسلمان عام طور پر پس ماندگی کا شکار رہتا تھا۔ میری حیثیت کلاس میں اجنبی کی سی تھی۔ نام کے آگے "خاں" لگا دیکھ کر کچھ ہم جماعت مجھے "کابلی والا" قسم کی شے سمجھنے لگے۔ اسکول میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا لیکن بنگالی ہر سو تھی۔ میں نے بہت جلد پا لیا کہ میری جماعت کا شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جو کسی نہ کسی قسم کی ہندوستانی میں بات نہ کر سکتا ہو۔ ان کی ہندوستانی میں بات کرنے کی صلاحیت قدرتی تھی۔ ڈھاکے کے نوابی خاندان کے لڑکے اردو پڑھتے تھے اور اردو کو مادری زبان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے لہجہ اور محاورہ پر بنگالی کا اثر نمایاں تھا لیکن انھوں نے حیرت ناک طور پر کئی صدیوں سے اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے اپنے سینے سے لگائے رکھا تھا۔ ان کے زیرِ اثر ڈھاکے کے کم از کم ایک محلے، اسلام پورہ کے مسلمان گھروں میں اردو ہی بولتے تھے۔ کلاس کے دیگر ہندو اور مسلمان ہم جماعت بھی اپنی اپنی استعداد کے مطابق مجھ سے اردو میں بات کرتے۔ میں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ ان میں سے اکثر غیظ کے عالم میں بے دریغ اردو کا استعمال کرتے بالخصوص گالی گلوج کے وقت وہ اپنی مہذب زبان کی تنگ دامنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو کی اس بارے میں وسعت و توانائی سے بلا تکلف فائدہ اٹھاتے۔ بنگالی کی مقبولِ عام گالی (اور تکیہ کلام بھی) "شالا" (سالا) ہے لیکن ہمارے ساتھی کریم (جو خود کو کریم اور مجھے موسود حوسین کہتے تھے) اس سے کہاں مطمئن ہو سکتے تھے اس لئے وہ اردو کی چنیدہ گالیوں کو اپنی قوتِ اظہار کا وسیلہ بناتے لیکن ان کا استعمال دوسروں سے زیادہ خود اپنی ذات پر کرتے! اسکول کے ہم جماعتوں میں کریم کے علاوہ اس وقت کئی نام ذہن میں آ رہے ہیں۔ بھومک، راجہ سین گپتا، ذکی ــ لیکن یہ سب نام ہیں۔ ان کی حامل شخصیتیں میرے لئے زمانہ کے غبار میں کھو چکی ہیں۔ صرف دو زندہ حقیقت ہیں۔ نورالدین جو تا حال ڈھاکہ یونی ورسٹی کے ڈپٹی رجسٹرار تھے اور نورا نرائن چودھری جنھیں میں نے پینتیس سال بعد "شنکو" کے مشہور و معروف سنگتراش کے نام سے بازیافت کیا۔ شنکو پہلے بڑودہ اور آج کل نئی دہلی میں مقیم ہیں۔ ملاقات کے وقت جب میں نے ان کے اصل نام پر اصرار کیا تو انھیں خود اپنا وجود بیگانہ سا لگنے لگا۔ نورا نرائن شنکو کے سنگین مجسمہ میں او عجب ہوا، ڈھل چکا ہے!

آرمنی ٹولہ گورنمنٹ ہائی اسکول سے ایک بڑی ٹولی نے ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن اور امتیازات کے ساتھ پاس کیا۔ یہاں سے نکل کر ہم لوگ تتر بتر ہو گئے۔ نورا نرائن شنکو بننے کے لئے شانتی نکیتن چلے گئے۔ دہشت پسند بھومک کسی انقلابی سرگرمی کا شکار ہو گئے۔ میں نے اور نورالدین نے گورنمنٹ انٹر کالج میں داخلہ لیا۔ کالج کے پرنسپل مسلم یونی ورسٹی کے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)، پرنٹر و پبلیشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپا یا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا